اردو

دنیا کی دوسری بڑی زبان

تحریر

شاہ بلیغ الدین

اشاعت

سہ ماہی العلم کراچی

اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۷ء، شمارہ نمبر ۴، جلد ۴۷

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

زندہ باد کے نعرے زوروں پر تھے۔ مجمع تھا کہ لحہ لحہ بڑھ رہا تھا۔ ہال تو کب کا بھر چکا تھا لوگ باہر دروازوں اور کھڑکیوں کے پاسس نظر لگائے کھڑے تھے۔

دولھے کی طرح سجی سجائی گاڑی میں مہمان خصوصی آئے۔ سرو قد' گورے چٹے مگر دھان پان سے۔ بدن پر سوٹ' چمک دار جوتا' سچ مچ کے لاٹ صاحب دکھائی دے رہے تھے' مگر تھے وہ لاٹ صاحب سے بھی بڑے آدمی۔

یہ شہر تھا تو چھوٹا لیکن یہاں کے لوگ بڑے جوشیلے تھے۔ جگہ بڑی سرسبز و شاداب تھی۔ غربت ضرور تھی مگر مسلمانوں کی یہاں اکثریت تھی۔ یہ ملک کے بٹوارے سے پہلے کا موقع ہے۔ مہمان خصوصی کے پہنچتے ہی نعروں کا وہ زور اٹھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی مہمان خصوصی ان دنوں زمین کا گز لیے پھر رہے تھے۔ آج ارض ہٹالہ کے اس کونے پر کل اس کونے پر۔ اللہ نے ان کی شخصیت میں عجیب کشش رکھی تھی۔ جو ان کا نام سنتا ان کی طرف کھچا چلا آتا۔

شہ نشین پر پہنچے تو مہمان خصوصی کو بیچ کی کرسی پر بٹھایا گیا۔ آزو بازو کلکتے سے آئے ہوئے کچھ رہنما بیٹھ گئے۔ خموشی ہوگئی تو مہمان خصوصی نے اپنے ساتھ سیدھے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے رہنما سے کچھ پوچھا:

سوال تھا: کتنے آدمی ہونگے؟

عرض کیا گیا: بارہ پندرہ ہزار کے لگ بھگ ہونگے۔

پھر سوال ہوا: انگریزی کتنے لوگ سمجھ لیں گے؟

جواب ملا: پانچ چھے سو کے قریب۔

آخری سوال تھا: اور اردو؟

جواب، تھا: آدھے سے کچھ کم لوگ

پھر انھی صاحب نے کہا کہ جناب عالی' آپ فکر کیوں کرتے ہیں پاس جو موجود ہیں۔ آسپ کے ایک ایک لفظ کا بنگالی میں ترجمہ کروں گا۔ مہمان خصوصی یہ سن کر مسکرائے اور خاموش رہے۔

میمن سنگھ منتظمین بڑے خوش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بچہ بچہ مہمان خصوصی کا والہ و شیدا ہے۔ لوگ ان کا نام سن کر آس پاس کے دیہاتوں سے چلے آئے تھے۔ وہ بولیں گے تو مجمع خاموش سے سنتا رہے گا۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرے گا پھر مدتوں ان کی باتوں کو دہراتا رہے گا۔ مسلمانوں کی تو عید ہوگئی تھی۔

یہ واقعہ میمن سنگھ کا ہے۔ یہ چھوٹا سا شہر اس وقت صوبہ بنگال میں تھا۔ انگریز یہاں آئے تو پہلے پہل اس صوبے میں انھوں نے اپنے قدم جمائے تھے۔ یہ بڑے ظالم لوگ تھے۔ انھوں نے مسلمان کاری گروں کی انگلیاں کٹوادی تھیں۔ ہزاروں بے گناہ قتل ہوئے تھے۔ کلکتہ کی ایک کوٹھری میں جو بہت چھوٹی تھی' آدمیوں کو اس طرح ٹھونس دیا تھا جیسے دھان کے گٹھے تلے اوپر

چھت تک بھر دیے جاتے ہیں۔ سب مسلمان تھے سب اللہ کو پیارے ہوئے۔ یہ بات انھی کے آدمی ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں لکھی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھیں مروانے میں صدیوں سے ان کے ساتھ رہنے والے ہندو شریک تھے۔ جو ہر گھڑی لگائی بجھائی کرتے پھرتے تھے مسلمانوں کے خون سے کھیلی جانے والی ہولی کے دنوں میں مہمان خصوصی کی ایک جھلک دل کو بڑی ٹھنڈک پہنچاتی تھی۔ وہ سب مسلمانوں کو جوڑ کر اپنے ساتھ لے کر چلنے آئے تھے۔

مہمان خصوصی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو اللہ اکبر کے کڑکے شروع ہوئے۔ بچے بالے بھی چلا رہے تھے۔ کوئی چپ ہونے کو تیار ہی نہ تھا اتنے میں کھڑے کھڑے مہمان خصوصی نے کلمے کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھی۔ بس پھر کیا تھا' شور دبا' اور دبا اور پھر یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہر ایک توجہ سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ سب کی نظریں ان کے چہرے پر جمی تھیں۔ کوئی پلک جھپکنے کو تیار نہ تھا۔ ہاں! شہ نشین پر بیٹھے ہوئے بڑے لوگ جب جوش سے تالیاں بجاتے تو سارا مجمع ان کے ساتھ ہو جاتا۔

تقریر دیر تک ہوتی رہی۔ تقریر اردو میں ہوئی عجیب بات تھی۔ جو اردو جانتا بھی نہ تھا' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج وہ بھی اس بات کو سمجھ رہا ہے۔

مہمان خصوصی لوٹے تو ایک بار پھر ساری بستی اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ مدتوں یہ گونج باقی رہی حتی کہ ۱۹۴۷ء میں صوبہ بنگال مشرقی پاکستان بن گیا۔

عربک کالج دلی یہ تو یاد نہیں آتا کہ کتنی دنوں بعد کی بات ہے' لیکن ہے یہ میمن سنگھ کے جلسے کے بعد کی بات۔ ابھی ملک کا بٹوارا نہیں ہوا تھا مگر قریب آرہا تھا کہ ایک ایسا ہی جلسہ دلی میں ہوا۔ وہی مہمان خصوصی تھے۔ یہ جلسہ لڑکوں نے کیا اور دلی شہر میں اپنے کالج کی چار دیواری میں کیا لڑکے تو پھر لڑکے ہی ہوتے ہیں انھوں نے اپنے کالج کو دلہن کی طرح سجایا۔

تقریر کے بعد مہمان خصوصی کی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بچوں کی دعوت کیا ہوتی ہے' سیدھا سادا بورڈنگ ہاؤس کا کھانا تھا لیکن ایک ایک دانے میں محبت کی آنچ تھی۔ لقمہ لقمہ عقیدت کی لاگ لپیٹ نے سوندھا کر دیا تھا۔

اسس کالج کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ ابھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے انگریز حملہ آوروں کی تلواروں کی نوک پر نہ دھرا تھا کہ یہ درسگاہ قائم ہوئی۔ حیدر آباد کے آصف جاہی خاندان کے صوبے دار غازی الدین جنگ نے اسے قائم کیا۔ یہاں ایک دارالترجمہ بھی کھولا گیا کہ اردو میں کتابیں ترجمہ کرائیں۔ سب تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ سائنس کی پڑھائی بھی اردو ہی میں ہوتی تھی۔ ماسٹر رام چندر سائنس پڑھاتے تھے۔ اس کالج کا نام یوں بھی اہم ہے کہ سرسید احمد خاں' مولوی نذیر احمد' منشی ذکاء اللہ جیسے مشاہیر نے یہاں تعلیم پائی۔

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ کالج کے اس جلسے میں انھیں بھی بلا گیا۔ مولوی صاحب ان دنوں اردو کے محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ گاندھی جی ان پر ہندی اتھوا ہندوستانی کی چوٹ لگا رہے تھے۔ ہندوؤں کے بڑے نیتا نے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ تو عربی حروف میں لکھی جانے والی زبان ہے۔ مسلمانوں کو مبارک ہو۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ مولوی صاحب اسے پورے ہندوستان کی زبان قرار دیتے تھے اور ارض ہمالہ پر اردو کا حق جتاتے تھے۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ انھیں مہمان خصوصی کے ساتھ بٹھایا گیا مہمان خصوصی نے اس شام اردو میں تقریر کی تھی اور مولوی صاحب اس بات پر بڑے خوش تھے۔ کھانے کی میز پر مہمان خصوصی نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے پہل میں نے اردو میں کہاں تقریر کی؟ مولوی صاحب نے کہا' جی کہاں۔ مہمان خصوصی نے فرمایا' میمن سنگھ میں! پھر فرمایا' اسس جلسے میں سر عزیزالحق میرے ساتھ تھے۔

سر عزیزالحق عرصے تک کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے پھر وائسرائے کی کونسل میں تجارت کے وزیر بن گئے۔ وہ شیر بنگال مولوی فضل حق کے بھائی تھے جو عرصے تک صوبہ بنگال کے وزیر اعلیٰ رہے۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان پیش کرنے کا شرف بھی انھی کو حاصل ہے۔ میمن سنگھ کے جلسے کی وہی مہمان خصوصی کی تقریر بنگالی میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔

کھانے پر اپنی اس شام کی تقریر کا ذکر کرتے ہیں۔ محترم مہمان نے فرمایا کہ میری اردو تو تانگے والے کی اردو ہے۔

اورینٹل کالج لاہور کے شمارے اگست تا ستمبر ۱۹۷۶ء میں مولوی عبدالحق نے ایک مضمون لکھا ہے کہ عربک کالج دلی کے جلسے میں جو کچھ مہمان خصوصی نے ان سے فرمایا اس کے چار سال بعد انھیں مہمان خصوصی کے ایک اور جلسے میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ یہ بڑا اہم اور تاریخی اجلاس تھا جو دارالسلام میں منعقد ہوا۔

بابائے اردو دارالسلام مجلس اتحاد المسلمین حیدر آباد کا صدر دفتر تھا۔ مجلس کے لیے یہ زمین اور عمارت ۴۳-۱۹۴۲ء میں نواب بہادر یار جنگ نے خریدی تھی۔ نواب صاحب کی اپیل پر مسلمانان حیدر آباد نے جی کھول کر اس کی خریداری کے لیے عطیات دیئے تھے۔ حیدر آباد کی سیاسی تاریخ کے سارے اہم جلسے یہیں ہوئے۔ یہ جگہ بلدیہ حیدر آباد کے بیچوں بیچ میں واقع تھی۔

مولوی عبدالحق کی تو ساری زندگی حیدر آباد میں گزر گئی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پڑھ کر نکلے تو اپنے وطن ہاپڑ جا کر سب سے رخصت ہوئے اور پھر حیدر آباد کے ہو کر رہ گئے۔ مدرسہ آصفیہ کی صدر مدرسی کے بعد وہ انسپکٹر آف اسکولز یعنی صدر مہتمم تعلیمات بنے۔ پھر جو اورنگ آباد آگئے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ جائیں گے۔ اورنگ آباد میں وہ مقبرہ تیسرہ رابعہ درانی کے احاطے میں بڑے سرسبز اور پرفضا مقام پر رہتے تھے پھر وہ اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ یہیں انھوں نے فرحت اللہ بیگ کا لکھایا ہوا یادگاری مشاعرہ اسٹیج پر پیش کیا۔ رسالہ اردو یہیں سے نکالا۔ انجمن کا دفتر اور کتب خانہ بھی یہیں قائم کرلیا۔

جامعہ عثمانیہ کی ابتدا ہوئی تو مولوی صاحب کو حیدر آباد بلایا گیا۔ اس زمانے میں معتمد (سیکریٹری) تعلیمات سر اکبر حیدری سے مولوی صاحب کی خوب گھٹتی تھی۔ سر اکبر حیدر آباد کے وزیر اعظم بھی ہو گئے تو بھی تعلقات میں فرق نہ آیا۔ مولوی صاحب دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے ناظم ہو کر چلے آئے تو پھر دلی منتقل ہونے تک شہر حیدر آباد ہی میں رہے۔ وہ حیدر آباد کی سب دلکش بستی جوبلی ہلز پر ایک آرام دہ اور کشادہ مکان میں رہتے تھے۔ اسی مکان میں مولوی صاحب کے ساتھ گزری ہوئی اپنی زندگی کا تذکرہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی آپ بیتی "گرد راہ" میں کیا ہے۔ مگر ان سے زیادہ اچھا اور تفصیلی نقشہ بیگم حمیدہ اختر حسین نے اپنی آپ بیتی "ہم سفر" کے صفحات پر کھینچا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ آپ بیتی نہ لکھی جاتی تو مولوی صاحب کی

یہ ہماری بڑی بد نصیبی ہے کہ قائداعظم کے ارشاد کو بھی اب پچاسواں برس ہے' اسے دستور کی شق بنے ہوئے بھی چوبیس برس ہونے کو آئے ہیں مگر اردو آج بھی اپنے وطن میں اجنبی ہے۔ اردو کی ابتدا کہاں سے ہوئی' اس کے بارے میں چار معتبر دعوے ہیں:

۱۔یہ پنجاب میں شروع ہوئی۔

۲۔اسس کی ابتد سندھ سے ہوئی۔

۳۔دکن اس کی جنم بھومی ہے۔

۴۔ اردو آبنائے گنگا و جمنا کی پیداوار ہے۔

پنجاب کے حق میں پروفیسر ژول بلوک (فیلٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد۵' ۳۰ - ۱۹۲۸ء) شیر علی سرخوش (اعجاز سخن) اور پروفیسر محمود شیرانی کے عقیدت مندوں میں مولانا صلاح الدین نے اعلان کیا کہ اردو پنجاب کی بیٹی ہے۔

سندھ سے اردو کی ابتدا کا نظریہ پیش کرنے والوں میں علامہ سلیمان ندوی (نقوش سلیمانی) اور نواب صدر یار جنگ شیروانی مولانا حبیب الرحمٰن (مقالات اردو' انجمن اردوئے معلٰی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) شامل ہیں۔ علامہ سلیمان ندوی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں۔ اس لیے قریب قیاس یہ ہے کہ جسے ہم اردو کہتے ہیں اسس کا ہیولا وادی سندھ میں تیار ہوا۔ مولوی شرف الدین اصلاحی کا بھی یہی خیال ہے ج کا اظہار ان کی کتاب سندھی کے لسانی روابط میں ملتا ہے (پیر حسام الدین راشدی نے بھی صوبہ سندھ کو اردو کا مولد لکھا ہے' مدیر)۔

دکن کے بارے میں حکیم شمس اللہ قادری' مولوی نصیرالدین ہاشمی (دکن میں اردو) یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور پہلی کتاب جو خطہ واری بنیاد پو رااردو کے مولد و مسکن کا نظریہ پیش کرتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سندھ سے پہلے دکن کے ساحلی علاقوں سے عربوں کا ربط شروع ہوا تھا۔

چوتھا نظریہ نواح دلی اور بہار سے تعلق رکھتا ہے۔ سید انشاء محمد حسین آزاد سرسید احمد خاں اور پروفیسر گریرسن وغیرہ اس کے حق میں ہیں۔

ان چار نظریات کے منجملہ خطہ واری بنیاد پر دو نظریات موجودہ پاکستانی علاقوں کو اردو کا وطن بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق نے خطہ بلوچستان اردو کے ابتدائی روابط کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

دستوری ضرورت

قائد اعظم کےفرمان کے پچیس برس بعد تک اردو کی دستوری حیثیت کا اقرار ہی نہیں کیا گیا اور اب کوئی چوبیس برس سے دستور کی صرف ایک شق میں اس کا ذکر ہے۔ ۱۹۷۳ء میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ دس سال کے اندر اندر اردو کو اس کا اصلی مقام دے دیا جائے گا۔ جنرل ضیاء الحق صاحب نے اس کی مدت میں مزید دسس سال کا اضافہ کردیا۔ ضیاء الحق صاحب سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اس بارے میں کوئی مثبت قدم آگے بڑھاتے لیکن نہ جانے کیوں وہ کمزوری دکھا گئے۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے انڈونیشیا نے آزادی حاصل کی اور "ملائی" کو اپنی قومی زبان بنالیا کیونکہ ان کے رہنما نے اس کا اعلان کیا تھا۔ جاپانی کوئی ترقی یافتہ زبان نہیں ہے لیکن اسے بھی اپنے ملک میں قومی زبان تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ بھی ان کے قائد کا فیصلہ تھا۔ ہندوستان ذات پات کی تقسیم کی وجہ سے سخت لسانی تضادات میں پھنسا ہوا ہے لیکن جو فیصلہ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو نے کیا اسے ان کے ملک نے مان لیا حالانکہ یہ زبان اور ملکوں کو تو چھوڑیئے خود ہندوستان میں اکثر مقامات پر نہیں سمجھی جاتی۔ اسی لیے لوک سبھا میں سکھ اور دیگر نمائندے جن میں مسلمان شامل ہیں خالص اردو میں تقریریں کرتے ہیں۔ اگر گاندھی جی کی بات مان لی جاتی اور اردو کو عربی رسم الخط کے بجائے دیو ناگری رسم الخط میں لکھنے کی حامی بھر لی جاتی تو تقسیم ملک سے پہلے شاید کوئی سمجھوتا ہوجاتا۔ پاکستان کی ساری زبانیں اور بولیاں اسی تہذیبی اور تاریخی ماحول میں پلی بڑھی ہیں جن میں اردو زبان نے آنکھیں کھولیں۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی کا رسم الخط بلوچی، پشتو براہوی بلکہ پنجابی کا رسم الخط بھی اب تو عربی ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو اپنی شناخت اور پرداخت کے معاملے میں کوئی مفاہمت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اب یہ اور بات ہے کہ امید کے بالکل خلاف پاکستان میں اردو کے ساتھ معقول اور باوقار رویہ اختیار نہیں کیا گیا۔

قومی اسمبلی میں ضابطہ کار کے مطابق اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریریں ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے دور رکنیت میں دیکھا کہ اسمبلی کا پچانوے فیصد کام اردو میں ہوتا ہے۔ اراکین کی بہت بڑی اکثریت اردو ہی کو تقریر مباحث، نکتہ اعتراض، تجاویز اور قرار دادوں اور دستوری ترمیمات کے ذریعہ بناتی ہے۔ اور اسپیکر بھی دونوں زبانوں کا استعمال کرتے ہیں لیکن نوکر شاہی انگریزی سے چمٹی رہتی ہے۔ اسپیکر کو جب بھی اپنا فیصلہ (Rulling) دینی ہوتی ہے تو وہ انگریزی میں تیار کی جاتی ہے۔ اگر معقول رویہ اختیار کیا جائے اور دیانت داری کے ساتھ اس بات کا تجزیہ کیاجائے کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے میں رکاوٹ کیا ہے تو معلوم ہوگا کہ ہماری نوکر شاہی یا پاکستان سول سروس اس راہ کا سب سے بڑا روڑا ہے۔ یہ اس کی احساس برتری کے سوا کچھ نہیں۔

انا شاہی

بعض دفعہ اردو کے متعلق کچھ دلچسپ مظاہرے دیکھنے میں آئے ہیں۔ پچھلی اسمبلی کی بات ہے جب ایک خاتون کی سربراہی میں حکومت بنی۔ اسپیکر بن کر ملتان کے گیلانی صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے چناؤ کے بعد اراکین انھیں مبارکباد دے رہے تھے۔ ابھی اسمبلی کی فضا میں دستور کی پابندی اور اسمبلی کے ضابطے کی پابندی کے لیے اٹھائے ہوئے حلف کی آواز گونج رہی تھی کہ اکبر بگٹی صاحب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ وہ اس بات پر اڑ گئے کہ خود بدولت اپنے صوبے کی زبان میں تقریر کریں گے۔وہ کوئی پہلی بار اسمبلی میں نہیں آئے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ ضابطہ کار کے مطابق سوائے اردو اور انگریزی کے رکن اس ایوان میں کسی اور زبان میں تقریر نہیں کرسکتا۔ تجربہ کار اراکین نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی حتی کہ پیپلز پارٹی کے شیر افگن نے بھی انھیں سمجھایا لیکن "انا شاہی" کے مقابلے میں وہ کوئی اصولی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لطف کی بات یہ کہ انگریزی دور میں بھی بلوچستان کی عدالتوں کی زبان اردو تھی۔ اور ۶ مئی ۱۹۷۲ء سے بلوچستان میں دفتری کام کاج اردو میں ہوتا ہے۔ اس وقت

اکبر بگٹی صاحب کو دستور کی پاسداری کا کوئی خیال نہیں تھا جس کا حلف وہ چند لمحوں پہلے اٹھا چلے تھے۔ سارا ایوان حیرت سے انھیں دیکھتا رہا اور ٹی وی پر یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ زبان پر وہ دعائیہ فقرہ آیا جو آخری وقت میں دل کی گہرائیوں میں مرحوم لیاقت علی خان کی زبان پر آیا تھا ... اللہ پاکستان کی حفاظت کرے!

تاریخ تو تاریخ ہوتی ہے اس کا آئینہ سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ ہم پاکستان میں ۱۹۹۷ء میں جس زبان کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کے بارے میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں اس کے ساتھ ان لوگوں کا کیا سلوک تھا جو برطانوی راج یہاں قائم کرنے آئے تھے:

۱۔ انھوں نے ۱۷۹۹ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ قائم کیا تھا کہ انگریز حکام اردو سیکھ سکیں۔

۲۔ ۱۸۳۹ء میں کمپنی بہادر کے تمام صوبوں میں اردو عدالتی زبان بنا دی گئی تھی۔ انگریز مجسٹریٹ اردو میں فیصلے لکھتے تھے۔

۳۔ قانو فوجداری، تعزیرات اور دیوانی کے اردو تراجم کرا دیئے گئے تھے۔

۴۔ فورٹ ولیم کالج کے نصاب کے لیے اردو کی آسان کتابیں تصنیف کرنے کے لیے میرامن وغیرہ کو ملازم رکھا گیا۔

۵۔ انگریزی اردو اور اردو انگریزی لغات تیار کی گئیں۔

۶۔ گشتی مراسلے، سرکاری دستاویزات اور سرکاری احکام اردو میں جاری ہوتے تھے۔

حیدر آباد دکن

۱۸۷۳ء میں یعنی اب سے ایک سو چوبیس برس پہلے حیدر آباد دکن میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دی گئی۔ اس وقت وہاں بھی چار صوبے تھے۔ ہر صوبے کی زبان الگ تھی۔ تلنگی، مرہٹی، کنٹری کے تین الگ الگ صوبوں کے علاوہ ایک صوبہ ایسا بھی تھا جس میں تلنگی اور مرہٹی بولی جاتی تھی مگر اردو پورے صوبے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ یہ کام چھٹے نظام میر محبوب علی خاں کے زمانے میں ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں میر عثمان علی خاں نے دارالترجمہ اور ۱۹۱۹ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ، تاریخ، ریاضی، سائنس، زراعت، علاج حیوانات، طب، قانون، تجارت، انجینیئرنگ کی اعلیٰ ڈگریاں جن میں ایل ایل ایم۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی شامل ہیں، اردو میں پڑھا کر اردو میں امتحان لے کر دی جاتی تھیں۔

ابتدائی عدالتوں میں عدالت العالیہ اور جوڈیشنل کمیٹی میں مقدمات کی سماعت اردو میں ہوتی۔ عدالت العالیہ میں قائد اعظم محمد علی جناح، سرتیج بہادر سپرو، ام آر جیکار، بھولا بھائی ڈیسائی جیسے وکلا پیش ہوتے تھے۔ حیدر آباد کی مجلس وضع قوانین اور بعد میں منتخبہ اسمبلی میں سارا کام اردو میں ہوتا تھا۔ مجلس وضع قوانین میں مختلف مفادات (Interests) سے نمائندے نامزد ہوتے تھے۔ ان اعلیٰ عہدہ دا بھی شامل تھے۔ وکلا و سیاسی رہنماؤں کا البتہ انتخاب کیا جاتا تھا۔ مجلس وضع قوانین نے نہ صرف مملکت آصفیہ کے قوانین کو جو فارسی میں تھے، اردو میں تبدیل کیا بلکہ ضرورت زمانہ کے لحاظ سے نئے نئے قوانین بنائے۔ ان کی سیاسی تسوید نگاری (Drafting) اردو ہوتی تھی پھر بحث مباحثے کے بعد منظوری کے لیے نظام کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا جس طرح جمہوری حکومتوں میں مملکت کے صدر کو دستخط کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ تقسیم سے پہلے جب منتخب اسمبلی قائم ہوگئی تو

ضابطہ کار وہی تھا جو اب پاکستان میں ہے۔

میرے پاس ایل ایل بی کے نصاب کے تمام قوانین ایک جگہ مجلد ہیں۔ یہی وہ قوانین ہیں جو پاکستانی جامعات میں بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ قانونی لغات' جرح و تعدیل پر کئی کتابیں' طبی قوانین کا مجموعہ (Medico Legal book) اور نظائر اور قانونی نظائر (Law Reports) سب اردو میں دستیاب تھیں۔

دفتری کاروبار میں سرکاری نیم سرکاری خطوط' گشتی مراسلے' یادداشتیں' معروضات' قانونچے' قانونی مسودات' رودادیں اور ان سے متعلق اردو اصطلاحات اور قرائن پر دفتری کام کرنے والوں کو عبور تھا اور نہ ہی قلم رکتا تھا کہ کوئی انگریزی اصطلاح کے استعمال کی ضرورت پیش آئے۔

تقسیم سے پہلے ریاست بھوپال میں بھی دفتری زبان اردو بن گئی تھی۔ اور سارے کام بلا روک ٹوک اردو میں ہونے لگے تھے۔ پاکستان کی ریاستوں میں قبل تقسیم ملک بہاولپور' قلات' اور خیرپور میں اردو رائج تھی۔ اب بلوچستان اور آزاد کشمیر حکومت کے دفاتر اردو ہی میں کام کررہے ہیں۔

دوسری بڑی زبان

یونیسکو (UNESCO) کے محققین نے دنیا کی زبانوں کے بارے میں جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں انکی رو سے دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اردو کا نمبر دوسرا ہے۔ بھارت' سری لنکا' بنگلہ دیش' سیام' ملائشیا' سعودی عرب' سنگاپور' ہانگ کانگ اور ------ ریاستوں کو شامل کرکے پینتالیس (۴۵) ممالک میں اردو زبان مشترکہ ذریعہ اظہار (Lingua Franca) کا کام دے رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اب اردو انگلستان میں دارالعوام کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ ادھر امریکہ اور شمالی امریکہ کے کتنے شہر ہیں جن سے اردو اخبارات نکل رہے ہیں۔ جہاں مشاعرے ہوتے ہیں۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسے ہوتے ہیں۔ ابھی دو چار مہینے پہلے میں سان فران سسکو' لاس انجلز' شکاگو' نیویارک کے علاوہ مانٹریال' ٹورانٹو' اٹاوا اور دیگر مقامات پر اردو اجتماعات سے خطاب کرکے آیا ہوں۔ ماشاء اللہ اچھی خاصی تعداد ان جلسوں میں ہوتی ہے۔ صرف ٹورانٹو سے نکلنے والے اردو کے کم از کم بیس اخبارات میں دیکھ چکا ہوں۔ انھی شہروں میں ثقافتی تقریبات میں قوالیاں' شام غزل اور مشرقی موسیقی کی محفلیں جمتی ہیں جن میں بیشتر اردو کلام سنایا جاتا ہے۔

مصر کی جامعات میں اردو کا شعبہ قائم ہے۔ ہندوستان میں اب ابوالکلام آزاد کی یاد میں ایک اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ ہوگیا ہے جو حیدر آباد دکن میں قائم کی جارہی ہے۔ اردو دشمنی کے باوجود بھارت کی ۴۸ جامعات میں اردو پڑھائی جارہی ہے۔ مصر کی جامعات میں اردو کا شعبہ قائم ہے۔ ۱۹۸۹ء میں قاہرہ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ وہاں کے ریڈیو سے اردو کی نشریات بھی ہوتی ہیں۔ یہی حال سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں میں بھی ہے کہ وہاں کے نشریاتی ادارے گھنٹے دو گھنٹے کے اردو پروگرام نشر کرتے ہیں۔ ان پروگراموں میں کئی بار میں نے بھی حصہ لیاہے۔ میری کتاب روشنی سے یہاں اقتباسات سنائے جاتے ہیں۔ دبئ' ابو ظبی' مسقط' بحرین' کویت اور سعودی عرب کے بازاروں میں خریداری کے وقت اردو بولنے سے کوئی دقت

نہیں ہوتی۔ یہ بات میں ذاتی تجربے کے طور پر لکھ رہا ہوں۔

ٹی وی کے جتنے بھی چینل امریکہ میں ہیں ان سے اردو پروگرام برابر پیش ہوتے ہیں۔ مانٹریال' ٹورانٹو' اور نیویارک میں ریڈیو اور ٹی وی سے میری تقریریں نشر ہوئیں اور زبانی بات چیت یعنی Interview بھی نشر ہوا۔ شمالی امریکہ میں دو تین جامعات میں اردو کا شعبہ قائم ہے۔ ٹورانٹو یونیورسٹی میں شعبہ ثقافت جنوبی ایشیا کے صدر پروفیسر جیکب اسرائیل سے بات چیت ہوتی تو انھوں نے بتایا کہ پہلے ان کی یونیورسٹی میں بھی اردو شعبہ قائم تھا۔ اب پھر کوشش ہورہی ہے۔ وہاں کی جامعات کو اس تعلق سے عطیات کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ صاحب پروفیسر عزیز احمد کے ساتھ ٹورانٹو یونیورٹی میں پڑھاتے رہے ہیں۔ انھی کی ایک کتاب کے بارے میں ان سے ملاقات ہوئی تو اردو کا ذکر نکلا۔ وہ پاکستان اور ہندوستان کی سیاحت کرچکے ہیں۔

اردو کا سرمایہ

عربی کے بعد اسلام کے تعلق سے سب سے زیادہ لٹریچر اردو زبان میں ملتا ہے۔ پورے برصغیر کی کوئی اور زبان اس بارے میں اردو کی برابری نہیں کرسکتی۔ اسی طرح شاعری اور مختلف اصناف ادب میں بنگالی' مرہٹی اور ہندی کو بھی اردو نے کہیں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کا جتنا ادب اردو میں ہے برصغیر کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی نہیں۔ اردو کا لفظی خزانہ اردو کی کم عمری کے مقابلے میں حیرت انگیز ہے اور اس میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔اردو کے مقامی اثرات کااندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ریڈیو یا ٹی وی کے صوبائی پروگرام دیکھتے اور سنتے ہیں۔ آپ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ خاصی بڑی تعداد ان پروگراموں میں اردو الفاظ استعمال ہوتے ہی۔ ہاں' یہ اور بات کہ اردو کے مراکز کراچی اور لاہور سے شاید سیاسی اغراض کے پیش نظراب ایک نئی اردو کو ترویج دینے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس میں پی ٹی وی اور این ٹی ایم دونوں کا برابر کا حصہ ہے۔

یہ اردو انگریز کا ملغوبہ رقاص لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے شوبزنس کا گلیمر ہے۔

عہد حاضر کی ضروریات کے پیش نظر کمپیوٹر نے اردو صحافت اور علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت اور طباعت کے لیے غیر معمولی سہولتیں پیدا کردی ہیں۔ اردو صحافت اب رنگین طباعت کے معاملے میں برصغیر کی ہر زبان سے آگے بڑھ گئی ہے۔

لفظی تراش خراش' نئی نئی سائنسی ترکیبوں اور پیشہ ورانہ اصلاحات اور تجارتی حساب کتاب کے معاملے میں الحمدللہ اردو وقت کے ساتھ چل رہی ہے۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں البتہ اردو کو ایک بے بسی اور معذوری (Handi Cap) کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہماری بے حسی کا نتیجہ ہے۔ سارک کی کانفرنس میں اگر بھارتی وزیر اعظم ہندی میں تقریر کرسکتا ہے تو ہمارا وزیر اعظم اردو کیوں نہیں بول سکتا؟ قائد اعظم کی روح سے معافی کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سیاسی طالع آزما اقتدار کی رسہ کشی میں اتنی اہم دستوری ذمے داری کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں۔ جب کہ اس حقیقت کو سب مانتے ہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں کو متحد کرکے پاکستان کو وجود میں لانے کے لیے قائداعظم کی بصیرت کی بنیاد اسلام اور اردو ہی پر تھی۔